مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اسکے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں، اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں، جسکو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے، اپنے شایان شان حصہ نہیں لیتے، ایک ایسا معما بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کیلیے نہیں، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کیلیے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر، خود اسکی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اسکی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کیے جاتے، اس اصل مسئلے کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کیلیے زندگی و موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے، اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل کے رجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس معمّے کو سمجھنے اور مسلمان کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی

کی، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے کرنیکا ہے جنکے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں، اور اسکے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اُسکی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحب علم و صاحب فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے، اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نا اہل اور ناقابل اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے، اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کیلیے فی الواقع کونسا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے، محض چند سطحی اور حقیر سے جذبات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے بہت زیادہ زور دیکر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے، کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے، تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی

مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہوگئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپیریلیسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادی وطن کے مسئلے سے بڑھ کر ہم کو اسکی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں — یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے — یہ جادو عوام سے گذر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جنکا اصلی فرض یہ تھا کہ جانشینان رسول ہونیکی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے، اور جانشینان رسول ہونیکی حیثیت ہی سے اسکو حل کرنیکی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند ارباب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں اور جنکا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، مہر خاموشی نہ توڑینگے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کرینگے، تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپکو بڑے خطرے میں ڈالنا ہے کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سننی پڑینگی اور انسان کیلیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دلشکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جنکی بھلائی کیلیے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی ذات کے مفاد سے بڑھ کر اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انھیں ہر بُرے سے

بڑے نتیجہ کو برداشت کرنے کیلیے تیار رہنا چاہیے، اور کم از کم تذکیر کا فرض بجا لانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے، اور انکے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے، اور ان کے قلب و روح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر علاج تجویز کرینگے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رو میں بہتے جا رہے ہیں، اور نادانستہ انکی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے۔[1] مولانا کے علم و فضل، انکی صداقت، ان کے تفکر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ سے تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور انکی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا انکی ذات گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے، بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحب فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے — مولانا فرماتے ہیں۔

”اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو وہ اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کریں کہ اپنا

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت تو فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا جو ”انصاری“ کے رپورٹر نے روایت بالمعنی کے طور پر بیان کیا ہے۔

کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتی ہے اور مال غنیمت پر قبضہ کرتی ہے اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مال غنیمت میں جھگڑا کریں - یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہوکر آزادی کیلیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہوکر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں (" انصاری" مورخہ ۳ رمضان ۱۳۵۶ھ)۔

غور کیجیے! یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے: "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اسکی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے - اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے - جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی، جو ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں، شیروں کی طرح شکار مار لینگے تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آکر حصہ لڑانے کی کوشش کرے گی"۔۔۔ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے - اور اسکے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیران بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کیلیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں - پھر یہ "جنگ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں، ایسی پاک جنگ، ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا، اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینہ ہیں -

ایک دوسرے بزرگ جنکے علم، تقویٰ اور دیانت کا احترام میرے دل میں انکے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح آزادی کیلیے جدوجہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے، اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے، بلکہ ان کیلیے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چندور چند زائد ہیں۔ پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے" (مولانا حسین احمدؒ صاحب کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵ اپریل ۳۸ء)

یہاں بھی وہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کرکے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جدوجہد فی الواقع خالص آزادی وطن کی جدوجہد ہے اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جدوجہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس سے ان کا علحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ "انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے"۔

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالا مال ہیں، اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کیلیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۵۷ء کے بعد سے شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمراں ایسا نہیں آیا جس نے اکثریت کی جیرہ دستیوں سے بچاؤ کیلیے مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلمہ پالیسی نہ قرار دی ہو۔ اور یہ تنظیم اس تھوڑے سے وقفہ کے سوا جو تحریکِ خلافت

نے پیدا کر دیا تھا پورے استحکام کیساتھ باقی رہی ہے اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اسکی رضاعت اور تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں، اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے اُن پر عائد ہوتا ہے، بے پروا ہو جائینگے۔ پس جو چیز بنی بنائی موجود، اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چونے گارے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپکے اس حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدا، آپ کیوں اس درجہ مضطرب و سراسیمہ ہوں۔ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کرکے محض فرضی خطروں کا سدباب کرتی رہتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور بے خرد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقا، کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی اعدار کے حملوں کا ہدف بننے کیلیے چھوڑ دے گی۔" (الاصلاح - سرائے میر - مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:-

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اللہ سے ڈرائیے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی یہی "آزادی کی جنگ!) ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتمندی تمہارے ہی لیئے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے

اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو۔"

(حوالہ مذکور)

دیکھیے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہل قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں، ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر روسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بیچارا بچاؤ کی کوئی راہ نہ پاسکے، دنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتویٰ سنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کا اس قدر لطیف پیرایہ میں اوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حال زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیماکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کیے ہیں، جنکی رو سے دو مسلمانوں کے مقابلے میں ۳ غیر مسلموں کی رائے بہر حال صحیح ہے اور حکومت ہمیشہ اُسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیماکریسی کے اس قاعدہ کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھ کر وہ غیر مسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمت آزمائی اور عمل" کے میدان میں داد مردانگی دے رہے ہیں، کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتحمندی" ہے مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیر مسلم اپنی "فتحمندانہ" پوزیشن کو محفوظ رکھنے کیلیے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب، کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کیلیے ہر ممکن تدبیر کرنی ہی چاہیے، مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود انکے اپنے بہت سے ممتاز افراد بھی اس معاملہ میں غیر مسلموں کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی یہ ڈیماکریسی کی لعنت تو ان کو نعمت نظر آتی ہے، مگر اس لعنت سے بچنے کیلیے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں

تو ارشاد ہوتا ہے کہ اکثریت و اقلیت کا سوال چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیماکریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ دو مسلمان، چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں، باطل پر ہیں اگر انکے مقابلے میں فرعون یا سامری کی امت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں، صرف اللہ سے ڈرانا چاہیے۔" اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیماکریسی کے اس قاعدے کو قبول کرکے تم "ہمت آزمائی اور عمل کے میدان" میں کود پڑوگے تو "فتحمند" ہوگے، ورنہ یونہی "پست ہمتی کی خاک مذلت" پر لوٹتے رہوگے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں ہمت کرکے اسے کھاجاؤ، انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا جو عین "فتح مندی" ہے، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا، اور لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کیطرح اصرار کرتے رہے، تو "اولوالالباب" تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں "سرکار برطانیہ کے ٹوڈی" کا طعنہ دینگے!

سب سے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کیلیے اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ پچھلے سال جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ کا علم اٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "مسلمانوں کو اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اسلیے کہ ادائے فرض کا غیر مشروط تقاضا یہی ہے"، مولانا اپنی تمام تقریر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اُس تحریک میں آنکھیں بند کرکے شریک ہوجائیں جسکی اساس وطنی قومیت اور ڈیماکریسی کے انگریزی نمونہ پر رکھی گئی ہے، یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں،

اور ذلت کی موت مر جانے والے ہیں - پوری تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کیے بغیر چارہ بھی نہیں:

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگرس کی شرکت سے اسلیے انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے - انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائیگی، ہندوؤں کیلیے مفید ہوگی، مسلمانوں کیلیے مُضر ہوگی، چنانچہ ۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا....

"اب ملک اصلاحات کیلیے بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے - ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کیلیے ۱۸۸۸ء والی بات سودمند نہیں ہوسکتی - ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے - چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑ جاتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں........

"انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائیگا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دیگی.......

وہ خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جا رہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قویٰ کے سب سے پہلی طاقتور جماعت ہیں! اور پھر ان تمام خطروں کا

انسداد کیونکر ہوسکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک ریزولیوشن پاس کردے۔ جونہی اس نے ریزولیوشن پاس کر دیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے معاً چھٹ جائیگا......

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت انکی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے اور تحفظ کی راہ اسکے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلا دینے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو انکی ٹھنڈی رگوں کو گرم کرسکے، تو میں کہونگا ایسی زندہ نعشوں کیلیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں......"

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشأۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس قوم کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو کبھی "الہلال" و "البلاغ" کا ایڈیٹر تھا وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے ـــــ مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے، مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

(۱) "سیاسی اصلاح و تغیر کے معنی محض اُس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کیے ہوئے جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح و تغیر کی مخالفت کی" ـــ یہ بات اُس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت و نیابت کو اپنے لیے مفید پاکر قوم پرستانہ جوش کیساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر وقت

کی جادوگری کا تماشہ دیکھیے کہ اس نظریہ کو مولانا ابوالکلام بیان فرمارہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ فی نفسہ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

(۲) "مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری و نیابتی ادارات کے نمونہ پر کی جائیگی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کیلیے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کیلیے مضر ہوگی" ــــــ سیاسیات کا ایک طفل مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اُس بات کو قبول کر لیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر جان بوجھ کر ہمیں بے وقوف بنانے کیلیے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری و نیابتی اداروں کو یہاں ہمارے سر پر منڈھا ہے انکی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے، اور ان کو جوں کا توں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمراں اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہذا سید احمد خاں مرحوم کے دور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جا سکتا ہے تو وہ انکی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کیلیے انہوں نے اختیار کی، اور اس کو بھی اُس زمانے کے حالات سامنے رکھ کر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحبِ فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیے۔

(۳) "مسلمانوں نے کانگریس سے علحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی" ــــــ مولانا کو شائد خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریزی مدبّرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پٹا بھی

سیتا رامیّا ہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھ لی ہوتی تو شاید اپنی قوم کے دامن پر دھبّا لگانے کیلیے ہندوؤں کے کارخانۂ روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے ان کو کچھ نہ کچھ تامّل ضرور ہوتا۔

(۴) "اب ملک اصلاحات کیلیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کیلیے لڑ رہا ہے"۔ ـــــ یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدیدہ کو قبول کرکے الکشن لڑائے جاچکے تھے، امپیریلسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کیلیے کانگریس اپنی خدمات پیش کرچکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے۔ پھر جب اپنے عمل سے آپنے ثابت کردیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحات اور ان اصلاحات کیلیے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کیلیے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کیلیے لے رہا ہے، تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اسلیے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا منہ کالا نہیں کیا جاسکتا، مہاسبھائی ہندو کو تو ضرور زیب دیتا ہے مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

(۵) "مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریزی سنگینیں انکی حفاظت کیلیے ہندوستان میں موجود رہیں۔ یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس انکو تحفظ کا زبانی اطمینان دلادے"۔ ـــــ یہ بات بھی ایک ہندو امپیریلسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابو الکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اُسی نقطہ پر جمع ہوگئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں، "انقلاب" کا ڈراما ختم ہوچکا ہے، اور اسکی جگہ وہی دستوری ارتقا کا نصب العین برسر کار آگیا ہے جو ابتدا سے انکے پیش نظر تھا۔ "دستوری ارتقا" کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اسکی جگہ لینے کے لیے کافی طاقتور اور کافی قابو یافتہ نہ ہوجائے۔ اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ

انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف - بلکہ وہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی رسیاں کھول کھول کر اُسکے ہاتھ پاؤں باندھتا جاتا ہے - یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے، مگر مولانا ان کو الٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دور کیوں بھاگے جا رہے ہو! ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اسکے پھندوں میں دے کیوں نہیں دیتے!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے، اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں، اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں - جو تصویر اپنی اغراض کیلیے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اسکو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے - کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد صاحب یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں - فضا جن خیالات سے بھر دی گئی ہے، وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں - یہ ایک جادو ہے جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے، اور کیا بتائیے کہ کیسے کیسے عالی مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے - فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصور قومیت کو پیش نظر رکھکر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں "نیشنلزم" یا "قوم پرستی" کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک "قوم" ہے، اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے

فرقے ہیں۔ "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں، اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہاد مقدس میں کود پڑنے سے احتراز، بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طوفان کے شور و ہنگامہ سے دماغ اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کیساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، عالی حوصلہ، حریت پسند اور جنگ آزما قوم کو برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایان شان حصہ لینے سے روک رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے اتنے طعنے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اسکی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شائد یہ مسلمانوں کا قصور ہو، تو اسکی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ شائد اس "جنگ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو، شائد یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اُس جنس کے شیر نہ ہوں جن سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے، شائد اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ اِنکے ساتھ چلکر میں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکونگا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے۔ پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو اور کیا ہے جسکی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جا رہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور کھویوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں آتا کہ اسکا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ صفحات میں ناقابل تردید واقعات و شواہد سے ثابت کرونگا کہ فی الواقع صورت حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اِسی صورت حال نے اپنے اہلِ وطن کیساتھ سیاسی جدوجہد

یں حصہ لینے سے روک رکھا ہے ۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح کام رہا ہے، اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اسکے مفاد اور اُن اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا اسکے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف ۔۔۔۔ اس بحث میں میرے پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ اُن حضرات علماء کو انکی غلطی پر متنبہ کروں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انکو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہِ حق پر گامزن ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونیکے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اسکے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریق کار کو وہ بالکل صحیح طریق کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنیکے بعد میں ان سے درخواست کرونگا کہ اسکو ٹھنڈے دل سے پڑھیں انصاف کی نظر سے دیکھیں اور اس نور علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے تو نہیں بلحاظ اس کے کہ

غلط راستہ پر کتنی دور جا چکے ہیں، الٹے قدم واپس ہونا چاہیے اور راہ راست معلوم کرنیکے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقل سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے - اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں، تو میں ان سے مطالبہ کرونگا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں۔ محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گذشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا، یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے احقاق حق یا ابطال باطل ہوا کرتا ہے - براہِ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آیئے - جو حقائق میں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کر کے دلیل وحجت سے ـــــ حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت ـــــ ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے -

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اُس احساس ذمہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جسکی بنا پر وہ اپنے آپکو اپنے ہر عمل کیلیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے - پھر اسکا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابل ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں - جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں بھی شامل نہیں اور اس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کیطرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے - لہذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے - اسکے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہدینا چاہتا ہوں - میرا یہ خطاب ائمۂ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے - اُن جاہل مقتدیوں سے میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں - بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس اول نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ انکی خواہشات کے خلاف کہہ رہا ہے جوابی بحث، اور بحث بھی نہیں بلکہ (۲۱) بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں -